احتشام علی*

# انجمنِ پنجاب کے نظمیہ مشاعرے: نوآبادیاتی سیاق میں

## (مشاعرہ بہ عنوان 'حبِ وطن': خصوصی مطالعہ)



**Abstract:**

**The Poetic Recitations of the Anjuman-e Punjab: In the Colonial Context**

This article overviews the influence of the Anjuman-e Punjab, a colonial institution created to bring about social welfare, better education, as well as business etc. in 1865. The author explores this influence— or its remnants, rather— in the modern Urdu poem, arguing that colonial elements can be seen in works of the period. The article further views the objectives of Anjuman-e Punjab.

**Keywords:** Anjuman-e-Punjab, Colonial Institutions, Literature of Colonial Period, Modern Urdu Poem.

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں برِ صغیر کے مقامی باشندوں کی شکست کے بعد پرانے تہذیبی و ثقافتی سانچے انتہائی تیزی سے شکست و ریخت کا شکار ہوئے تھے۔ مغربی حکمرانوں نے ایک نئے معاشرے کی تشکیل کے لیے جو نئے اقدامات کیے اُن کے پسِ پُشت نوآبادیاتی صورتِ حال ہی کارفرما تھی۔ مغربی استعمارکاروں نے اپنے اجارے کو مستحکم کرنے کے لیے جو انتظامی و انصرامی تبدیلیاں کیں، اُن میں ایک اہم تبدیلی یہ ہوئی کہ یکم جنوری ۱۸۵۹ء کو چیف کمشنر (chief commissioner) کا عہدہ ختم کر کے لیفٹیننٹ گورنر (lieutenant governor) کی تقرری کے احکام صادر کیے گئے۔ اس دوران میں استعمارکاروں نے انتظامی معاملات پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے جب مختلف ریاستوں اور صوبوں کی سرحدوں کا ازسرِ نو تعین کیا تو دہلی کو

پنجاب کے ماتحت کر دیا۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہو گا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ(۱۷۸۰ء۔ ۱۸۳۹ء) کی وفات کے بعد پنجاب جس شدید قسم کے داخلی خلفشار، قتل و غارت اور بد انتظامی کا شکار رہا تھا، اُس کا بالواسطہ فائدہ انگریزوں کو ہی پہنچا تھا۔ ۱۸۴۹ء میں مہاراجہ شیر سنگھ(۱۸۰۷ء ۔ ۱۸۴۳ء) کی شکست کے بعد نواب گورنر جنرل ہندلارڈ ڈلہوزی(James Andrew Broun-Ramsay,1st Marquess of Dalhousie۔۱۸۱۲ء۔ ۱۸۶۰ء) نے ایک شاہی فرمان کے ذریعے جب پنجاب کی پوری ریاست کو ایسٹ انڈیا کمپنی(East India Company) کے زیرِ نگیں کیا تو مغربی استعمار کار یہاں کی مقامی آبادی کو یہ باور کرانے میں کافی حد تک کامیاب ہو گئے تھے کہ وہ پرانے حکمرانوں کی نسبت اُن کے زیادہ خیرخواہ ہیں۔ اورنگ زیب عالم گیر(۱۶۱۸ء۔ ۱۷۰۷ء) کے عہد میں سکھوں سے ہونے والے ناروا سلوک کے زخم ابھی تک تازہ تھے جس کی وجہ سے مقامی سکھ تختِ دہلی کو تشکیک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۷ء تک کمپنی کو پنجاب میں اپنی جڑیں مزید مضبوط کرنے کا موقع میسر آیا تو اُنھوں نے مقامی آبادی کی ذہنی کمزوریوں اور آپسی لڑائیوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنے اجارے کو مزید استحکام دیا۔ یہ اجارہ اس اعتبار سے دُور رس نتائج کا حامل تھا کہ اس سے ایک طرف تو کمپنی کے مالی محصولات میں بے بہا اضافہ ہوا اور دوسرا مقامی آبادی خصوصاً سکھوں کی فوج میں شمولیت سے کمپنی کی عسکری قوت کو بھی کافی تقویت ملی۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی پر انگریزوں کے دونوں بار غالب آنے میں پنجاب کے مقامی باشندے ہراول دستے کے طور پر سامنے آئے اور ستمبر ۱۸۵۷ء میں تسخیرِ دہلی کے وقت بھی سکھ فوجی ہی پیش پیش تھے۔ اس تمہید کا مقصد نو آبادیاتی ہندوستان میں مغربی استعمار کاروں اور پنجاب کے مقامی باشندوں کے درمیان قائم ہونے والے اُس تعلق کو سامنے لانا ہے جس نے اُردو زبان کی آبیاری کے لیے میر(۱۷۲۳ء ۔ ۱۸۱۰ء) اور غالب(۱۷۹۷ء ۔ ۱۸۶۹ء) کی دلّی، آتش(۱۷۷۸ء ۔۱۸۴۸ء) اور ناسخ (۱۷۷۱ء ۔ ۱۸۳۸ء) کے لکھنؤ کی بجائے لاہور کا انتخاب کیا تھا۔ حافظ محمود شیرانی(۱۸۸۰ء ۔ ۱۹۴۶ء) درج بالا صورت حال کا محاکمہ کرتے ہوئے پنجاب میں اردو(۱۹۲۸ء) میں لکھتے ہیں:

> پنجاب کے ساتھ اردو کے تعلقات کی کہانی ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد سے شروع ہوتی ہے، جب کمپنی سیاسی اغراض کی بنا پر اپنے مقبوضات میں اردو کی ترویج و اشاعت کی موید تھی[۱]۔

حافظ محمود شیرانی کا یہ اقتباس مغربی استعمار کاروں کی اُردو زبان میں دلچسپی اور اُن کے مستقبل کے عزائم کو نشان زد کر رہا ہے۔ یہ وہی نو آبادیاتی عزائم ہیں جن کی تکمیل کے لیے جنگِ آزادی کے محض آٹھ سال بعد ''انجمنِ اشاعت مطالبِ مفیدہ پنجاب'' (Society for the Diffusion of Useful Knowledge in the Punjab) کا ڈول ڈالا گیا۔ ۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو سکھشا

سبھا (حویلی راجہ دھیان سنگھ، اندرون ٹکسالی دروازہ، لاہور) میں جب اس انجمن کا پہلا جلسہ منعقد ہوا تو اسے نہ صرف حکومتِ وقت کی مکمل حمایت حاصل تھی بلکہ استعمار کاروں کے قابلِ اعتماد عمائدین کا بھی مکمل تعاون حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انجمن کے بنیاد گزاروں میں جہاں کرنل ہالرائیڈ (Colonel Holroyd ۔سرشتہ تعلیم پنجاب) کا نام آتا ہے، وہیں اُن کے ایما پر جی ڈبلیو لائٹنر (Gottlieb Wilhelm Leitner ۔ ۱۸۴۰ء تا ۱۸۹۹ء) پرنسپل، گورنمنٹ کالج لاہور نے بھی انجمن کی صدارت قبول کرنے میں کسی قسم کا پس وپیش نہیں کیا تھا۔ حکومتی مشینری کے مقامی عہدہ داران مثلاً دیوان بیج ناتھ (ای ۔اے ۔سی ، لاہور)، فقیر سید شمس الدین (آنریری مجسٹریٹ، لاہور)، سردار بھگوان سنگھ (جاگیردار، امرتسر)، شیخ فیروز الدین (رئیس، لاہور)، مولوی کریم الدین (ڈپٹی انسپکٹر مدارس، لاہور)، مولوی محمد حسین (نائب سرشتہ دار، ڈائریکٹری پنجاب)، مولوی نیاز حسین (مدرس مدرسہ تعلیم معلمین)، مولوی علمدار حسین (مدرس، گورنمنٹ کالج، لاہور) اور پنڈت من پھول (اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر) کی پہلے اجلاس میں موجودگی اس امر کو نشان زد کرتی ہے کہ اس انجمن کی تشکیل کا منصوبہ اور ایجنڈا سوچ سمجھ کر تیار کیا گیا تھا۔ پہلے اجلاس میں انجمن کے جو مقاصد طے ہوئے، اُن پر نظر دوڑائیں تو ساری صورتِ حال واضح ہوجاتی ہے۔ انجمن کے مقاصد درجِ ذیل تھے:

۱۔ قدیم مشرقی علوم کا احیا اور لسانیات ، بشریات، تاریخ اور ہندوستان اور ہمسایہ ملکوں کے آثارِ قدیمہ کے بارے میں تحقیقی کام کی حوصلہ افزائی۔

۲۔ دیسی زبانوں کے ذریعے عوام میں تعلیم کا فروغ۔

۳۔ صنعت اور تجارت کی ترقی۔

۴۔ معاشرتی، ادبی ،سائنسی اور عام دل چسپی کے سیاسی مسائل پر تبادلہ خیالات، حکومت کے تعمیری اقدامات کو مقبول بنانا ، ملک میں وفاداری اور مشترک ریاست کی شہریت کے احساس کو فروغ دینا اور عوام الناس کی خواہشات اور مطالبات کے مطابق حکومت کو تجاویز پیش کرنا۔

۵۔ مفادِ عامہ کے تمام اقدامات میں صوبے کے تعلیم یافتہ اور بااثر طبقوں کو افسروں سے قریب تر لانا[۲]۔

مندرجہ بالا تمام مقاصد اپنی کثیر الجہتی کے باعث اُس مخصوص نوآبادیاتی صورتِ حال کے نقوش اپنے ساختیے میں صورت پذیر کیے ہوئے ہیں جس کے تحت استعمار کار اپنے اجارے کو دوام بخشنے کے لیے خود کو ایک نجات دہندہ کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ درجہ بالا تمام مقاصد بظاہر ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود اپنی داخلی ساخت میں ایک دوسرے سے مکمل جڑت رکھتے ہیں ۔قدیم مشرقی علوم کا احیا مقامی باشندوں کو اس بات کا احساس دلانے کی شعوری کاوش ہے کہ نئے

حکمران اُن کی قدیم تہذیب اور کلچر سے کس درجہ وابستگی رکھتے ہیں لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ علوم کسی نو آبادیاتی جبر کا شکار قوم کو استعمار کے چنگل سے چھڑوانے میں مدد و معاون ہو سکتے ہیں؟ یقیناً ہر ذی شعور انسان اس سوال کا جواب نفی ہی میں دے گا۔اسی طرح لسانیات ، بشریات ،تاریخ ،ہندوستان اور ہمسایہ ملکوں کے آثارِ قدیمہ کے بارے میں تحقیق کی حوصلہ افزائی کرنا استعمارزدہ لوگوں کو حال کی ابتلاؤں اور مستقبل کی پیش بندیوں سے بیگانہ کر کے ایک ازکار رفتہ ماضی سے منسلک کرنے کے مترادف تھا۔ دیسی زبانوں کے ذریعے علم کا فروغ بھی استعمار زدہ لوگوں کو اپنے عہد کی اُس 'اے پس ٹیم' (Episteme) سے دور رکھنے کی طرف کنایہ کرتا ہے،جس سے منسلک ہونے کے بعد مقامی باشندے استبداد کی زنجیروں کو توڑنے کے لیے کوئی بہتر لائحۂ عمل ترتیب دے سکتے تھے۔اسی طرح صنعت وتجارت کی ترقی اور حکومت کے تعمیری اقدامات کو مقبول بنانے کے علاوہ،معاشرتی ،ادبی، سائنسی اور سیاسی مسائل پر تبادلۂ خیال کی دعوت دینا ایک ایسی مکالمے کی فضا تشکیل دے رہا تھا، جو جنگِ آزادی کے بعد مقامی باشندوں کے دلوں میں کھولتے نفرت کے لاوے کو اخراج کی راہ دکھا سکتا تھا۔ مفادِ عامہ کو بنیاد بنا کر صوبے کے بااثر اور پڑھے لکھے افراد کو افسروں کے قریب لانا اُس نو آبادیاتی حکمتِ عملی کا زائیدہ تھا جس کے تحت لارڈ میکالے(T.B.Macaulay۔۱۸۰۰ء۔ ۱۸۵۹ء)نے ۲ فروری ۱۸۳۵ء کو منٹ آف انڈین ایجوکیشن(Minute of Indian Education) پیش کرتے ہوئے درج ذیل خیالات کا اظہار کیا تھا:

> موجودہ زمانے میں مقامی لوگوں کی ایسی جماعت بنانے کی اشد ضرورت ہے جو ہمارے اور لاکھوں محکوموں کے درمیان ترجمانی کا فریضہ انجام دے سکے۔ایسے افراد کی جماعت جو رنگ اور نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوں لیکن ذہانت، اخلاق، ذوق اور خیالات کے لحاظ سے انگریز ہوں [۳]۔

دیسی زبانوں اور اس کے ادب میں از حد دل چسپی لینے کا سبب استعمارکاروں کے ہاں اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ وہ مقامی باشندوں کی نمائندگی کے لیے ایسے علوم کا انتخاب کر رہے تھے جو جدید مغربی علوم کا پاسنگ بھی نہیں تھے۔مشرقی اور مغربی علوم کے امتزاج کی بات کرتے ہوئے بھی یہ بات باور کروائی جارہی تھی کہ جدید عہد میں ترقی اور کامیابی کی منازل کے تمام راستے جدید مغربی علوم ہی سے ہو کر جاتے ہیں ۔اس ضمن میں ناصر عباس نیر(پ: ۱۹۶۵ء) اپنے مقالے میں لائٹنر کی درج ذیل رائے پیش کرتے ہیں:

> میرا مقصد، مقامی اور انگریزی علوم دونوں کی ایک ساتھ ترقی ہے۔دونوں کی یک جائی،اطمینان بخش نتیجہ پیدا کرے گی۔تمھیں عربی ،سنسکرت اور فارسی پر مشتمل اپنی مقدس روایت ہرگز نظر انداز نہیں کرنی چاہیے ۔اس روایت میں اپنی جڑیں مضبوط کرنے کے بعد تم انگریزی فکر ،انگریزی ایجادات،انگریزی سائنس اور فنون اور

انگریزی تہذیب کی بالائی ساخت کا اضافہ کر سکتے ہو۔آیئے ہم مشرق کے لیے مغرب اور مغرب کے لیے مشرق،فراموش نہ کریں[۴]۔

یہ اقتباس ایسے رویے کی نشان دہی کر رہا ہے جس کے تحت نوآبادیاتی اجارے کو استحکام بخشنے کے لیے مقامی باشندوں کے ذہن و دل میں یہ احساس اجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ 'استعمارکار' کی حیثیت ایک نجات دہندہ کی سی ہے۔مذکورہ عہد کی علمی روایت میں بھی زیادہ تر مستشرقین ،مقامی باشندوں کے ادب،کلچر اور تہذیب کو انتہائی تضحیک آمیز انداز میں دیکھتے تھے۔مثال کے طور پر ۱۸۳۵ء کی تعلیمی پالیسی میں ہی لارڈ میکالے مشرق کے حوالے سے اپنا اور دیگر مستشرقین کا نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے :

مجھے کوئی ایک بھی ایسا مستشرق نہیں مل سکا جو اس بات سے انکار کر سکے کہ پورے ہندوستان اور عرب کا مقامی ادب، کسی اچھی یورپین لائبریری کے ایک شیلف کی بھی ہمسری کر سکتا ہے[۵]۔

اسی زمانے میں جون سٹورٹ مِل (John Stuart Mill_۱۸۰۶ء - ۱۸۷۳ء) اپنے مقالے آزادی اور نمائندہ حکومت (Liberty and Representative Government) میں درجہ بالا نکات ہی کی توثیق کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

اُس(جے ایس مل) کے نظریات اور خیالات ہندوستان میں قابلِ اجرا نہیں ہیں،کیوں کہ اہل ہند نسلی لحاظ سے نہ سہی،تہذیبی لحاظ سے گھٹیا ہیں[۶]۔

تہذیبی لحاظ سے کسی کو ''گھٹیا'' قرار دینا جہاں خارجی سطح پر بیان کنندہ کی تہذیبی اور ثقافتی برتری کو واضح کر رہا ہے،وہیں 'تہذیبی لحاظ' سے گھٹیا مقامی لوگوں کو مغربی تہذیب کے ذریعے مہذب بنانے کا بھی اعلامیہ ہے۔درج بالا اقتباسات یہاں رقم کرنے کا مقصد مغربی استعمار کی اُس نو آبادیاتی حکمتِ عملی کو بیان کرنا ہے جس کے تحت 'ہم' اور 'وہ' کے باہمی رشتوں کو اپنے موافق بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔جے ایس مل اور لارڈ میکالے کے خیالات کا تعلق اُس زمانے سے ہے جب مقامی باشندوں کی تہذیب اور کلچر کو تسلیم کرنے سے مسلسل انکار کیا جا رہا تھا۔دیسی باشندوں کی فلاح اور ترقی محض اس بات سے منسلک کر دی گئی تھی کہ ہندوستان مکمل طور پر تاج برطانیہ کے زیرِنگیں آجائے ،لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد اپنے اجارے کو مستحکم کرنے کے لیے مقامی باشندوں کو اس وہم میں مبتلا رکھنا ضروری تھا کہ مغربی استعمار کا ہر قدم اُن کی فلاح ،بہبود اور 'فائدے' کے لیے ہے۔انجمن پنجاب،جس کے قیام کا ظاہری مقصد دیسی باشندوں کے لیے 'علومِ مفیدہ' کا فروغ تھا مغربی استعمارکاروں کے افادے کی راہ ہموار کر رہی تھی ۔ناصر عباس نیرّ 'انجمنِ پنجاب' کے انھی مقاصد کو سامنے لاتے ہوئے لکھتے ہیں:

غور کریں تو اِن مقاصد میں کہیں بھی تضاد نہیں۔ان کثیر مقاصد کی تہ میں ایک باقاعدہ وحدت موجود ہے۔دوسرے لفظوں میں یہ تمام مقاصد دراصل ایک بنیادی متن کی تفسیریں ہیں۔یہ بنیادی متن ''علومِ مفیدہ'' ہے[۷]۔

درج بالا اقتباس میں جس بنیادی متن کو نشان زد کیا گیا ہے، جدید شاعری کی نئی عمارت کی تعمیر کا پورا منصوبہ اُسی پر استوار کیا گیا تھا۔انجمنِ پنجاب کے ابتدائی جلسوں میں جہاں دیگر سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل زیرِ بحث آئے وہیں لائٹنر نے ۲۳ اگست ۱۸۶۵ء کو منعقدہ جلسے میں انجمن کے لیے ایک لیکچرر کی تقرری پر اصرار کیا اور اُن کی نظرِ انتخاب مولوی حسین آزاد (۱۸۳۰ء۔ ۱۹۱۰ء) پر پڑی جو یکم جنوری ۱۸۶۴ء سے ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن، پنجاب کے ورنیکولر آفس میں ملازم تھے[۸] اکرام چغتائی اپنے مضمون ''آزاد اور لائٹنر کے علمی روابط'' میں لائٹنر کے اپنے الفاظ یوں نقل کرتے ہیں:

لیکچر دینے کے لیے ہمیں ایک لائق شخص کو ملازم رکھنا لازم ہے۔ہماری رائے میں مولوی محمد حسین صاحب لائق شخص ہیں۔اور وہ اس کام کو بخوبی انجام دے سکتے ہیں[۹]۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اپنے نئے حکمرانوں کا اعتماد حاصل کر لینے کے بعد آزاد ۲۷ مارچ ۱۸۶۶ء[۱۰] کو پنڈت من پھول (س۔ن۔) کے ہمراہ سرکاری محکمہ سے ہدایت لے کر ایک خصوصی مشن پر وسط ایشیا روانہ ہوئے تھے اور آٹھ ماہ کے بعد جب اپنی سرکاری ذمہ داریاں نبٹا کر واپس پہنچے تو اُنھیں انجمن کے اجلاس میں تین عہدے سونپے گئے۔مذکورہ اجلاس کی روداد دفعہ نمبر ۴ میں درج ہے:

صاحب پریذیڈنٹ نے فرمایا کہ مولوی محمد حسین آزاد کو اگر سیکرٹری انجمن کا مقرر کیا جاوے تو یقین ہے کہ انجمن کی بہت رونق اور ترقی ہوگی۔ترتیب رسالہ انجمن اور کام یونیورسٹی کا بھی ان کے متعلق رہے گا[۱۱]۔

انجمنِ پنجاب کے تحت جدید شاعری کا منصوبہ زیرِ بحث لانے سے قبل مولانا حسین آزاد کے انجمن اور نئے حکمرانوں سے استوار ہونے والے روابط کا بیانیہ نوآبادیاتی صورتِ حال کی اُس پیچیدگی کو نشان زد کر رہا ہے جس کے بارے میں ایڈورڈ سعید(Edward Said۔ ۱۹۳۵ء۔ ۲۰۰۳ء) لکھتے ہیں:

نوآبادی میں بسنے والے لوگ حکمران کے لیے عام مفادات بن جاتے ہیں۔علم خواہ عام قسم کا ہو یا مخصوص قسم کا۔پہلے ایک ماہر کے ہاتھ ترتیب دیا جاتا ہے اور پھر حکومت کے تمدنی نظام سے وابستہ لوگ جو اس سے لگاؤ رکھتے ہیں،اس کی چھان پھٹک کرتے ہیں۔مقامی اور مرکزی مفادات کا کھیل کسی لحاظ سے بھی بے اصول اور بلاشعور نہیں ہوتا[۱۲]۔

یہی وجہ ہے کہ مقامی باشندوں میں سے ''ماہر آدمی'' کا چناؤ کرنے کے بعد جب اُسے وفاداری کی کسوٹی پر کَس کے استعمار زدہ لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو ہر نیا کلامیہ مقامی باشندوں کو انحراف اور انجذاب کی گومگو کیفیت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ مقامی اشرافیہ، استعمار سے ذاتی فوائد کے حصول کی خاطر اُن کے ہر صحیح اور غلط قدم کا خیر مقدم کرتی ہے جب کہ اپنی روایات، تہذیب اور اقدار سے چمٹے مقامی لوگ ہر نئی تبدیلی کو تشکیک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مقامی لوگوں کی معاونت سے مختلف علوم اور فنون کا فروغ بین السطور ایک مخصوص استعماری زاویۂ نظر کو اجاگر کرنے کی شعوری کوشش ہوتا ہے۔ ۱۵ اگست ۱۸۶۷ء کے جلسے میں آزاد نے اپنے لیکچر 'نظم اور کلام موزوں کے باب میں' جن خیالات کا اظہار کیا، اُن میں معاصر شعریات کی تبدیلی کے متعلق کسی واضح منصوبے کے آثار تو نہیں تھے، لیکن مستقبل کی پیش بندی ضرور کی گئی تھی۔ مثال کے طور پر آزاد نے مشرقی شعریات میں خیالات کی خرابی کا ذمہ دار اُن سلاطین و حاکمانِ عصر کو ٹھہرایا تھا جن کی غلط قدر دانی کے باعث شاعری میں کئی قباحتیں پیدا ہوئی تھیں۔ برِصغیر کے نئے حکمران انھی خرابیوں کو دور کرنا چاہتے تھے اور یہ سب بلا شعور نہیں تھا۔ درجہ بالا صورتِ حال کا محاکمہ کرتے ہوئے جمیل جالبی (۱۹۲۹ء-۲۰۱۹ء) لکھتے ہیں:

> انجمن پنجاب کے مشاعرے خود اُن (آزاد) کی ایجاد نہ تھے بلکہ ناظمِ تعلیمات کرنل ہالرائڈ کی فرمائش پر وجود میں آئے تھے اور خود کرنل ہالرائڈ نے یہ قدم لیفٹیننٹ گورنر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اٹھایا تھا جو چاہتے تھے کہ اُردو شعرا بھی انگریزی انداز کی ایسی جدید نظمیں لکھیں جنھیں اردو کی نصابی کتابوں میں شامل کیا جاسکے۔[۱۳]

مولانا حسین آزاد نے انجمن کے ۸ مئی ۱۸۷۴ء کے اجلاس میں لیکچر دیتے ہوئے جب اہلِ وطن کو یہ باور کرایا کہ تہذیب و ثقافت کی طرح اب اُن کی شاعری کے سوتے بھی خشک ہوگئے ہیں اور اُن کی نظم کے لیے سامانِ آرائش، پہلو میں دھرے اُن انگریزی صندوقوں میں بند ہے، جن کی کنجی ہمارے ہم وطن انگریز دانوں کے پاس ہے تو وہ اُسی فوق تصور کو پروان چڑھا رہے تھے جو نو آبادیاتی آئیڈیالوجی (ideology) کے تحت تشکیل دیا گیا تھا اور جس کا پہلا اور آخری مقصد مقامی باشندوں کے ذہن و دل پر اجارہ حاصل کرنا تھا۔ اس لیکچر کے بعد آزاد نے مطلوبہ شاعری کا رول ماڈل فراہم کرنے کے لیے اپنی 'مثنوی موسُوم بہ شب قدر' سنائی۔ آزاد کے بعد کرنل ہالرائیڈ کی تقریر نے جدید شاعری کے منصوبے پر مغربی حکمرانوں طرف سے مہر تصدیق ثبت کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا:

> یہ جلسہ اس لیے منعقد کیا گیا ہے کہ نظمِ اردو جو چند عوارض کے باعث تنزل اور بدحالی میں پڑی ہوئی ہے۔ اِس کی ترقی کے سامان بہم پہنچائے جائیں۔ اِس واسطے جملہ رؤسا اور اہلِ علم لوگوں سے جو شعر و سخن اور تصانیف کا

> ذوق رکھتے ہیں، درخواست کی جاتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اس کی طرف توجہ دیں۔ اس وقت مولوی محمد حسین نے جو مضمون پڑھا اور رات کی حالت پر شعر سنائے وہ بہت تعریف کے قابل ہیں اور ہم سب کو مولوی محمد حسین کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ یہ نظم ایک عمدہ نمونہ اس نظم کا ہے جس کا رواج مطلوب ہے[۱۴]۔

استعمار کی نظر میں نظمِ اردو کو لاحق چند بنیادی عوارض میں سے ایک عارضہ وہ قومی اور ملی طرزِ اظہار بھی تھا جس کی جھلک اُسے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران میں جا بجا نظر آئی تھی۔ اردو نظم کو قلبِ ماہیت کے عمل سے گزارنے والے منصوبہ ساز، اُردو شاعری کی روایت میں استعارے کی اُس باطنی قوت سے پوری طرح آگاہ تھے جس کے تحت:

''دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری''

جیسا ایک مصرعہ بھی جبر واستبداد کی پوری کہانی کو اپنے ساختیے میں صورت پذیر کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ کرنل ہالرائیڈ آزاد کی نظم کو بہ طورِ نمونہ پیش کر کے جس نظم کو رواج دینے کا عندیہ دے رہے تھے، اُس میں متن کا تصور سادہ اور اکہرا ہونے کے باعث، اُس استعاراتی اور مجازی تفاعل سے یکسر محروم تھا جو استعمارکاروں کے لیے خطرے کی گھنٹی کے مترادف تھا۔ شعری متن کے اسی استعاراتی پہلو کو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد بھی مختلف شاعروں نے اپنی نظموں اور غزلوں میں استعمال کیا تھا، جدید شاعری کے نئے تصور سے جس قسم کی نظم کا رواج مطلوب تھا، اردو شاعری کی روایت اُس سے تہی نہیں تھی۔ نظیر اکبر آبادی (۱۷۴۰ء۔ ۱۸۳۰ء) سترھویں صدی میں ان موضوعات کو اپنی نظموں میں کامیابی سے برت چکے تھے، جنھیں اب انگریزی زبان کے صندوقوں میں تلاش کیا جا رہا تھا۔ انجمن کے زیرِ اہتمام ۳۰ مئی ۱۸۷۴ء کو باقاعدہ موضوعاتی مشاعروں کا آغاز ہوا تو ابتدائی دونوں مشاعرے 'برسات' اور 'زمستاں' کے عنوان سے منعقد کیے گئے۔ یہ دونوں موضوعات نیچرل شاعری کے اُس مغربی تصورِ شعر پر پورا اترتے ہیں جس پر بات کرتے ہوئے محمد حسین آزاد آبِ حیات (۱۸۸۰ء) میں لکھتے ہیں:

> جس شے کا حال یا دل کا خیال لکھیے تو اسے اس طرح ادا کیجیے کہ خود وہ حالت گزرنے سے یا اس کے مشاہدہ کرنے سے جو خوشی یا غم، غصہ یا رحم، یا خوف، یا جوش دل پر طاری ہوتا، یہ بیان وہی عالم اور وہی سماں دل پر چھا دیوے[۱۵]۔

اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو پہلے دو مشاعروں کے بعد نیچرل شاعری کے موضوعات میں تبدیلی آ گئی تھی اور باقی موضوعات کا انتخاب کرتے ہوئے اس بات کو پیشِ نظر رکھا گیا تھا کہ جلسوں میں ایسی شاعری پیش کی جائے جو مقامی باشندوں کے ذہن و دل میں مغربی استعمار کے لیے نرم گوشہ پیدا کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ تیسرے مشاعرے سے لے کر دسویں

مشاعرے تک کے موضوعات ایک مخصوص تہذیبی اور ثقافتی سیاق میں سامنے آتے ہیں۔**اُمید، حبِ وطن، امن، انصاف، مروت، قناعت** اور **تہذیب** جیسے موضوعات پر لکھی گئی نظمیں اُن سیاسی اور سماجی تقاضوں کے عین مطابق تھیں جنھیں استعمار کار مقامی آبادی میں پھلتا پھولتا دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ اگرچہ ان مشاعروں میں مولانا حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی(۱۸۳۷ء۔۱۹۱۴ء) کے علاوہ دیگر شعرا دوسرے اور تیسرے درجے کے تھے لیکن مختلف موضوعات پر ایک مخصوص زاویۂ نظر سے خامہ فرسائی کرنے میں، وہ بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو برِ صغیر میں یہ دور 'غیر مشروط انجذاب' کا دور تھا۔ مقامی باشندوں اور اُن کے عمائدین کے پاس اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں بچا تھا کہ وہ استعمار کے کسی بھی ایجنڈے کی راہ میں مزاحم نہ ہوں۔ مغربی استعمار کار اپنی تہذیبی و ثقافتی برتری کے لیے مختلف کلامیے وضع کرنے کے بعد خود کو ایک ایسے ''نجات دہندہ' کے طور پر پیش کر رہے تھے جس کا مقصد مقامی باشندوں کو نئے تہذیبی و ثقافتی منابع سے روشناس کرا کے ایک 'مہذب' اور 'مفید' شہری بنانا تھا۔ یاد رہے کہ نو آبادیاتی صورتِ حال میں 'مفید'، 'افادے' اور 'افادیت' جیسے مظاہر اپنی تمام تر جدلیات کے ساتھ محض استعمار ہی سے منسوب ہوتے ہیں۔ ان نئے موضوعاتی مشاعروں میں پڑھی جانے والی مختلف نظموں کے متن کا اجمالی جائزہ اس بات کی توثیق کرے گا کہ ان نظموں میں پائی جانے والی نئی حسیّت مقامی باشندوں کی سوچ اور نظریات کو نہ صرف ایک نئے فکری سانچے میں منقلب کر رہی تھی بلکہ نیچرل شاعری کے نام پر شعری متن کو بھی خود اکتفائی سے محروم کیا جا رہا تھا۔

مولانا محمد حسین آزاد کو انجمن کے رُوحِ رواں کی حیثیت حاصل تھی، اغلب ہے کہ اِن مشاعروں کے موضوعات کا انتخاب اُن کی اور کرنل ہالرائیڈ کی مشاورت سے ہوتا ہوگا۔ نو آبادیاتی سیاق میں انجمن کا چوتھا مشاعرہ بہ عنوان '' حُبِ وطن ''اِس اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس مشاعرے کی نظموں میں وطن کی محبت کا بیانیہ خالص یورپی نقطۂ نظر سے تشکیل دیا گیا تھا۔ یہ مشاعرہ یکم ستمبر ۱۸۷۴ء کو ہوا تھا، آزاد اور حالی کے علاوہ اس میں گیارہ شعرا نے شرکت کی تھی۔[۱۶] اس مشاعرے میں پیش کی جانے والی بعض نظموں کا مطالعہ اس لحاظ سے انتہائی دل چسپ ہے کہ متن میں اُن نو آبادیاتی کلامیوں کو واضح شعور ملتا ہے، جن کے فروغ کے لیے انجمن پنجاب جیسے اداروں کا قیام ناگزیر ہوجاتا ہے۔ مثلاً پنڈت کرشن لال طالب (اکاؤنٹینٹ، صیغۂ تعمیرات، راولپنڈی) 'حبِ وطن کے جوش' کی مختلف صورتوں کو نظم میں بیان کرتے ہوئے جب ۱۸۵۷ء کے واقعات کو بیان کرتے ہیں تو اُن کے پیشِ نظر خالصتاً استعماری نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ وہ جنگِ آزادی کی قیادت کرنے والے مختلف عمائدین کے ہاں موجود 'حبِ وطن کے جوش' کو ایک منفی جذبے کے طور پر سامنے لاتے ہیں اور انھی مقامی راہ نماؤں کو اِس آشوب کا ذمہ

دار بھی قرار دیتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دیتا ہے دم کے دم میں قوی سلطنت پلٹ
جب جوش کچھ دکھاتا ہے حُبِ وطن کا جوش
مفسد نمک حرام بنا کر کبھی کبھی
فوجوں کے سر کٹاتا ہے حُبِ وطن کا جوش
باغی کو بادشاہ بنا اپنے ملک کا
اورنگ پہ بٹھاتا ہے حُبِ وطن کا جوش
دل کو سیاہ کر کے کبھی مثلِ ناناراؤ
منہ کالا بھی کراتا ہے حُبِ وطن کا جوش [۱۷]

مولانا حسین آزاد نے جو منظومات انجمن کے پلیٹ فارم سے پیش کیں، وہ زیادہ تر تمثیلی پیرائے میں تھیں۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ آزاد کی ادبی تنقید نو آبادیاتی دباؤ کے زیرِ اثر جس طرح مختلف تضادات کا شکار ہوئی، اُسی طرح اُن کی نظموں کے متن میں بھی مشرقی اور مغربی شعریات کی آویزش نے کئی تناقضات کو جنم دیا۔ آزاد کی ادبی تربیت کلاسیکی شعریات کے زیرِ اثر ہوئی تھی لیکن نئے حکمرانوں نے انجمنِ پنجاب کے تحت جس شعری ادب کی تخلیق کا منصوبہ بنایا تھا، اُس میں مغربی شعریات کی حل پذیری ازحد ضروری تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انجمن سے وابستہ بہت سے نظم نگاروں کی نظمیں اپنے فکری اور فنی اسقام کی بدولت انگریزی نظموں کی ایک بھونڈی سی نقل محسوس ہوتی ہیں۔ آزاد کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہوئے اُن کی تمثیلی پیرائے میں لکھی بیشتر نظمیں مثلاً 'صبحِ امید'، 'خوابِ امن'، 'دادِ انصاف'، 'وداعِ انصاف' اور 'گنجِ قناعت' ایک مخصوص سانچے اور پیٹرن (Pattern) میں ڈھل کر قاری پر کوئی گہرا تاثر قائم کرنے میں ناکام رہتی ہیں۔ شعری اظہار جیسے بے ساختہ عمل کے دوران میں کسی مخصوص ایجنڈے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے متن سازی کا عمل نو آبادیاتی صورتِ حال کی اُس جبریت کو سامنے لاتا ہے، جو مقامی تخلیق کاروں سے مغرب کی تہذیبی، ثقافتی اور اخلاقی برتری کو تسلیم کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔ انھی معروضات کے سیاق میں انجمن کے چوتھے مشاعرے میں پڑھی جانے والی آزاد کی مثنوی ''حُبِ وطن'' کے متن کے کچھ حصے ملاحظہ ہوں، جس میں بیان کنندہ برِصغیر کے مقامی باشندوں کے دلوں میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے مثالیں بھی یورپ سے فراہم کرتا ہے۔ مذکورہ نظم کا درج ذیل حصہ دیکھیے، جس میں آزاد، مغل فرمانروا فرخ سیر (۱۶۸۵ء۔ ۱۷۱۹ء) کے دربار سے، ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے خصوصی مراعات حاصل کرنے والے طبیب ولیم ہملٹن (William Hamilton۔ ۱۷۸۸ء۔ ۱۸۵۶ء) کو حُب الوطنی کی ایک اعلیٰ

و ارفع مثال کے طور پر قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں:

فرخ سیر تھا ہند میں فرمانراوئے ملک
اور غیرتِ نسیم و صبا تھی ہوائے ملک
پر ہند پر تھا حادثۂ غم عجب پڑا
یعنی کہ بادشاہ تھا خود جاں بلب پڑا
اس طرح کا فتور پڑا تھا مزاج میں
تھا مبتلا وہ اک مرضِ لاعلاج میں
سب اہلِ عقل ہوش و حواس اپنا کھو چکے
سارے طبیب ہاتھ علاجوں سے دھو چکے
پر اس مسیح دم نے جو آ کر کیا علاج
ایسا بحسبِ طبع موافق پڑا علاج
گویا دوا بہ کارِ دعا ہو گئی اُسے
اور تین چار دن میں شفا ہو گئی اُسے
نوبت خوشی کی بج اٹھی سارے جہان میں
اور جانِ تازہ آ گئی اک اک کی جان میں
فرخ سیر کہ شاہِ سخاوت مآب تھا
بحرِ کرم کا جس کے جھکولا سحاب تھا
اک جشنِ عام اُس نے کیا دھوم دھام سے
اور شورِ تہنیت کا اٹھا خاص و عام سے
حاضر ہوئے امیر و وزیر آ کے سامنے
اور اس طبیب کو کہا بلوا کے سامنے
لا دامنِ امید کہ بھر دیں ابھی اُسے
تا عمر پھر نہ پائے تو خالی کبھی اُسے
دریا دلی طبیب کی دیکھو مگر ذرا
ڈالی نہ اُس نے لعل و گہر پر نظر ذرا

حب الوطن کے جوش سے بیتاب ہو گیا
دل آب ہو کے سینے میں سیماب ہو گیا
کی عرض ہاتھ جوڑ کے خدمت میں شاہ کی
بندہ کو آرزو نہیں کچھ عزّ و جاہ کی
زر کی ہوس، نہ مال کی ہے جستجو مجھے
پر آرزو جو ہے تو یہی آرزو مجھے
کچھ ایسا میرے واسطے انعام عام ہو
جس سے مرا تمام وطن شاد کام ہو
بولا یہ شاہ اِس کا بھی تجھ پر مدار ہے
جو مانگنا ہے مانگ، تجھے اختیار ہے
تب عرض کی طبیب نے یوں بادشاہ سے
روشن جلالِ شاہ ہو خورشید و ماہ سے
تھوڑی زمیں نواحی دریا کنار میں
مجھ کو عطا ہو مملکتِ شہریار میں
تا اس طرف جو میرے وطن کے جہاز آئیں
اور اُن میں تاجرانِ ذوی الامتیاز آئیں
کچھ اُن پہ ہووے راہ نہ بیم و زوال کو
آرام سے اتاریں یہاں اپنے مال کو
اور جنس جو کہ لائیں وہ نزدیک و دور سے
محصول سب معاف ہو اُس کے حضور سے
پہلا علاج گر چہ بہت کارگر پڑا
یہ نسخہ لیکن اُس سے سوا پُر اثر پڑا
اس کی بھی یعنی کلفتِ غم دور ہو گئی
اور تھی جو کچھ کہ بات وہ منظور ہو گئی
ہر چند اُسے نہ فائدۂ سیم و زر ہوا
پر نفع بہرِ اہلِ وطن کس قدر ہوا

دامن میں اک عطائے خداداد پڑ گئی
اور سلطنت کی ہند میں بنیاد پڑ گئی
نوبت بجا کرے گی سدا صبح و شام کی
آواز دیں گے طبل مگر اُس کے نام کی [۱۸]

آزاد کی مثنوی کا اتنا طویل ٹکڑا یہاں رقم کرنا بے محل نہیں ہے۔ یہ ٹکڑا اُس نو آبادیاتی جبر کو سامنے لا رہا ہے، جس کے تحت مقامی تخلیق کار نو آبادیاتی صورتِ حال کا مکمل شعور رکھنے کے باوجود بھی استعمار کاروں کی بدعہدی اور منافقت کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ مغربی حکمرانوں کی ذات کے منفی پہلو بھی مثبت بن جاتے ہیں۔فرخ سیر کے عہد میں پیش آنے والا یہ واقعہ ہندوستان میں انگریزی استعمار کی خشتِ اول کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن آزاد نے اِسے منظوم کرتے وقت اصل متن کی تقلیب اس انداز میں کی ہے کہ استعمار کاروں کی مقامی حکمرانوں سے بدعہدی اور وعدہ شکنی، حب الوطنی کی مثال بن گئی ہے۔ استعمار کار، شعری متن پر تصرف کے بعد مقامی لوگوں سے جس غیر مشروط وفاداری کا خواہاں ہوتا ہے، مذکورہ نظم میں اُس کا اظہار جگہ جگہ دکھائی دیتا ہے۔ درج بالا واقعے کو منظوم کرنے کے علاوہ آزاد نے مثنوی کے متن میں تین مزید ایسے واقعات شامل کیے ہیں، جنھیں اِسی مشاعرے میں شیخ الٰہی بخش رفیق (مدرس) بھی اپنی مثنوی ''کلیدِ محبت'' (یہ مثنوی بھی اسی مشاعرے بہ عنوان 'حب وطن' میں پڑھی گئی تھی) میں پہلے ہی منظوم کر چکے تھے۔دو شاعروں کے ہاں ایک ہی عنوان کے تحت، کم و بیش ایک سے واقعات کا بیانیہ یقینا ایک جیسی فکرِ رسا کا نتیجہ نہیں ہو سکتا، لہٰذا یہ سوال قابلِ غور ہے کہ ان واقعات کا مآخذ کیا تھا۔ نظمِ آزاد کے مرتب محمد ابراہیم (پسرِ محمد حسین آزاد) ۱۹۱۰ء میں چھپنے والے ایڈیشن کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

> مشاعرہ مذکورہ بالا کے بند ہونے کے بعد وہ کبھی کبھی انگریزی نظموں کے انداز پر نظم لکھتے رہے۔ یہ بالکل انگریزی نظم کا ترجمہ نہیں ہیں۔ چنانچہ ناظرین مقابلہ کر کے دیکھیں گے کہ انگریزی نظم (ایکسلشیر) کے انداز پر جو نظم ہے، وہ ترجمہ نہیں ہے۔ البتہ انگریزی مطالب کو ہمارے انداز میں اُردو کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ اسی طرح تمام نظمیں صفحہ ۸۹ سے ۱۰۳ تک انگریزی مطالب ہیں۔ مگر ان کو نہیں کہہ سکتے کہ یہ انگریزی کا ترجمہ ہے[۱۹]۔

درج بالا اقتباس میں محمد ابراہیم اس اَمر کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ ''انجمن پنجاب'' کا مشاعرہ بند ہو جانے کے بعد آزاد نہ صرف انگریزی نظموں سے ماخوذ نظمیں لکھ لیتے تھے بلکہ انگریزی مضامین کو اردو کے قالب میں ڈھالتے ہوئے بھی مقامی عناصر پیش نظر رکھتے تھے۔ اس ضمن میں اُنھوں نے ایک نظم کا بہ طورِ خاص ذکر بھی کیا ہے، لیکن اُن کی اِس تحریر سے یہ

بات واضح نہیں ہوتی کہ اگر آزاد نے 'انجمنِ پنجاب'' کے مشاعروں کے لیے نظمیں لکھتے ہوئے انگریزی نظموں کے متن سے استفادہ کیا تھا تو اِس استفادے کی نوعیت کیا تھی۔ انجمنِ پنجاب کے مشاعرے بعنوان 'حُبِ وطن' کے متن کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں آزاد کی مثنوی ''حُبِ وطن'' اور شیخ الٰہی بخش رفیق کی مثنوی ''کلیدِ محبت'' میں یورپی تاریخ سے لیے گئے تین بالکل ایک جیسے واقعات ملتے ہیں۔ مثال کے لیے پہلے شیخ الٰہی بخش رفیق کی مثنوی سے لیا گیا ایک تاریخی واقعہ ملاحظہ ہو:

روما پہ سنتے ہیں کہ چڑھا اک غنیم تھا
اور تا بہ شہر آ گیا بے خوف و بیم تھا
دریائے ٹائبر تھا رواں نیچے شہر کے
موجیں بلا کی جس میں تھیں، گرداب قہر کے
یہ اِس طرف تھے اور وہ دریا کے پار تھے
لیکن اُنھیں بھی خوف وخطر بے شمار تھے
روما میں جو کہ تین بہادر تھے انتخاب
لکھتے ہیں یوں وہ بیش بہا دُرِ آفتاب
نکلے وہ اپنی فوج سے کچھ دل میں ٹھان کے
یوں دشمنوں سے کہنے لگے پُل میں آن کے
دریا نہیں، یہ موت کے دریا کا پاٹ ہے
سمجھے ہو جس کو گھاٹ، وہ تیغوں کا گھاٹ ہے
اک آن لینے دیں گے نہ زنہار دم تمھیں
دم میں اُتار دیں گے تہِ آب ہم تمھیں
اُن دونوں میں دلیر مگر کوکلیز تھا
حب الوطن میں غرق وہ صاحب تمیز تھا
آ ہوش میں اپنے دلِ غم خوار سے کہا
قبضے کو دیکھا اور یہ تلوار سے کہا
اے تیغ رکھیو اپنی حفاظت میں تُو ہمیں
اور کر تُو پیشِ اہلِ وطن سرخرو ہمیں

حب الوطن کے معرکے میں اپنا نام ہو
ہاں اے زبانِ تیغ یہ جھگڑا تمام ہو
حسرت سے پھر کے جانبِ شہر اک نگاہ کی
اور بند آبِ تیغ سے اپنی یہ راہ کی
اک اک کو روکتا رہا وہ مار مار کے
اور اپنی فوج کو یہ صدا دی پکار کے
جلدی طنابِ صبر و تحمل کو توڑ دو
ہم لڑتے ہیں اِدھر، تم اُدھر پُل کو توڑ دو
پھر دونوں دوستوں سے کہا پار جاؤ تم
اور میرے ساتھ اپنی نہ جانیں گنواؤ تم
کیا جانے زندگی مری اب ہو بھی یا نہ ہو
اور تم خدا کو سونپ کے جلدی روانہ ہو
اصرار کر کے دونوں کو پیچھے ہٹا دیا
وہ یار ادھر ہوئے تھے کہ بس پُل گرا دیا
تنہا جو کوکلیز ہی بے چارہ رہ گیا
اور اُس کے نام فتح کا نقارہ رہ گیا
دریا میں کودا اور کہا اللہ کا نام لے
یا رب تو ہاتھ اپنے سپاہی کا تھام لے
دو تین ہاتھ مار کے جھٹ مار ہو گیا
حب الوطن کی فوج کا سردار ہو گیا[۲۰]

اب آزاد کی مثنوی میں اسی تاریخی واقعہ کا بیانیہ ملاحظہ ہو جس کی ترتیب میں بھی سرِ مُو فرق نہیں ہے:

اور ہے لکھا مؤرخ عہدِ قدیم نے
روما پہ کی جو فوج کشی اِک غنیم نے
تیار اہلِ فوج پئے کارزار تھے
پر اہلِ ملک اُن سے سِوا جاں نثار تھے

آیا حریف جب کہ نہایت قریبِ شہر
اُٹھے برائے جنگ امیر و غریبِ شہر
پر اُن میں کوکلیز جو مردِ دلیر تھا
حُب الوطن کے حق میں نیستاں کا شیر تھا
نکلا وہ سج کے اسلحۂ جنگ اپنے شہر سے
اور لشکرِ عدو کی طرف آیا قہر سے
دو جاں نثارِ حبِ وطن اور ساتھ تھے
اعدا کے خوں میں ڈوبے سدا جن کے ہاتھ تھے
ہے جیسے بحرِ گنگ کا مائی لقب یہاں
تھا ٹائبر کو باپ کہا کرتے سب یہاں
وہ بحر نیچے شہر کے تھے اوجِ موج پر
پُل سے اتر کے آئے یہ دشمن کی فوج پر
پُل کا دہانہ روک کے تیغوں کے گھاٹ سے
اعدا کے خوں بہاتے رہے کاٹ کاٹ کے
اور اپنی فوج کو یہ پکارے کہ آؤ تم
حملہ تو ہم نے روک لیا پُل گراؤ تم
مسمار ادھر وہ کرتے رہے پُل کو آن کر
یہ تیر و نیزے مارے گئے تان تان کر
پُل سارا ٹوٹ ٹوٹ کے دریا میں بہ گیا
اِک آدمی کا راہگذر جب کہ رہ گیا
تب کوکلیز یاروں سے بولا کہ جاؤ تم
اے میرے پیارے ہم وطنو! غم نہ کھاؤ تم
قسمت میں جو لکھا ہو سو ہو، چھوڑ دو مجھے
تم جاؤ اور خدا کے حوالے کرو مجھے
اک اک رفیق جب کے اُدھر پار ہو گیا
اور پُل جو کچھ رہا تھا وہ مسمار ہو گیا

للکارا پہلے دشمنوں کو دھوم دھام سے
اور ٹائبر میں کہہ کہ یہ کودا دھڑام سے
ٹالا ہے تو نے سر سے عدو کی تباہی کو
اور میرے باپ لی جیو اپنے سپاہی کو
دشمن کی فوج تیغیں سنبھالے ہی رہ گئی
اور موت اپنے دانت نکالے ہی رہ گئی
دیکھو تو فیضِ حُبِ وطن اُس کو کیا ملا
جھٹ چار ہاتھ مار کے یاروں سے جا ملا[۲۱]

انجمنِ پنجاب کے مذکورہ مشاعرے میں مقامی باشندوں کے دلوں میں حب الوطنی کا جذبہ بیدار کرنے کے لیے شیخ الٰہی بخش رفیق اور مولانا حسین آزاد نے جن تین واقعات کو نظم کے قالب میں ڈھالا، طوالت کے پیشِ نظر اُن میں سے محض درج بالا واقعہ کی دونوں منظوم صورتیں پیش کی گئی ہیں۔متن کی خارجی شہادتوں اور مضمون میں اِس درجہ مطابقت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے صفیہ بانو (۱۹۲۸ء۔۲۰۰۲ء) قیاس کرتی ہیں :

> مولانا آزاد اس زمانے میں مشاعروں اور انجمنِ پنجاب کے روحِ رواں تھے۔لہٰذا جو نظمیں مشاعروں میں پڑھنے کے لیے بھیجی جاتی تھیں،اُن کے معیار کو جانچنے میں آزاد بھی شامل تھے۔شیخ الٰہی بخش رفیق کی مثنوی ''کلیدِ محبت'' میں جو کہانیاں نظم کی گئی ہیں، آزاد نے انھی کہانیوں کو فصیح تر اور مؤثر زبان میں نظم کیا۔ پہلا قصّہ دوملکوں کی سرحد کے تعین سے متعلق ہے۔دوسرا کوکلیز کا اور تیسرا رستم کا۔ بلکہ مولانا نے اپنے اشعار میں رفیق کی مثنوی کا حوالہ بھی دیا ہے[۲۲]۔

اقتباس میں دونوں شاعروں کی نظموں کے متن کا تقابل ایک محدود پیمانے پر کرتے ہوئے نہ صرف ان کہانیوں کے اصل مآخذ تک رسائی کے امکان مسدود کر دیے گئے ہیں، بل کہ مولانا کے اشعار میں رفیق کی مثنوی کے حوالے کا ذکر کر کے اُنھیں خیالات کی چوری کے الزام سے بھی بری الذّمہ کردیا گیا ہے۔انجمنِ پنجاب کے مشاعرے (۱۹۹۵ء) میں اِس مشاعرے کا پورا متن دستیاب ہے۔آزاد کی مثنوی کا مرکوز مطالعہ کرنے کے بعد کہیں کوئی ایک شعر بھی ایسا نہیں ملتا جس میں رفیق کی مثنوی کا کوئی حوالہ دیا گیا ہو۔البتہ رستم والے واقعے کے علاوہ دونوں واقعات اُسی ترتیب سے منظوم ہوئے ہیں جس ترتیب سے اُنھیں رفیق کی مثنوی میں بیان کیا گیا ہے۔درج بالا دونوں واقعات میں سے ایک واقعے کا مأخذ تو لارڈ میکالے کی نظموں کے مجموعے لیز آف انشیئنٹ روم (Lays of Ancient Rome۔ ۱۸۴۲ء) مشہورِ زمانہ نظم ہوریشیس (Horatius) میں موجود ہے، جس

میں قدیم روم کے عظیم سپہ سالار ہوریشیس کوکلیز (Horatius Cocles) کی بہادری اوردریائے ٹائبر (Tiber River) کے کنارے اُس کی اپنے وطن کے لیے جاں نثاری کوخراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ اس واقعہ کے بنیادی نکات کم وبیش اُسی طرح منظوم کیے گئے ہیں،جس طرح میکالے نے اپنی طویل نظم میں بیان کیے ہیں۔میکالے کی نظم کے چند بند دیکھیے:

Then out spake brave Horatius,
The Captain of the gate:
"To every man upon this earth
Death cometh soon or late.
And how can man die better
Than facing fearful odds
For the ashes of his fathers
And the temples of his gods,

Alone stood brave Horatius,
But constant still in mind,—
Thrice thirty thousand foes
"Down with him!" cried false Sextus,
With a smile on his pale face;
“Now yield thee,” cried Lars Porsena,
“Now yield thee to our grace!"

"OTiber! Father Tiber!
To whom the Romans pray,
A Roman’s life, a Roman’s arms,
Take thou in charge this day!”

So he spake, and, speaking, sheathed
The good sword by his side,
And, with his harness on his back,
Plunged headlong in the tide[23].

میکالے کی درجہ بالا نظم ۵۸۵ سٹینزا (stanza) پر مشتمل ہے، یہاں محض تین سٹینزا نقل کرنے کا مقصد آزاد اور الٰہی بخش رفیق کی نظموں کے متن میں موجود اُن نو آبادیاتی کلامیوں کو نشان زد کرنا ہے جن کی ترویج اور فروغ کی ذمہ داری انجمنِ پنجاب کے توسط سے مقامی نظم نگاروں کو سونپی گئی تھی۔ نو آبادیاتی صورتِ حال کی پیچیدگی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہاں اس مفروضے کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ استعمار کار، ملی اور قومی موضوعات کا انتخاب کرنے کے بعد، مقامی نظم نگاروں کو کچھ ایسے متن یا انگریزی شاعری کے نمونے بھی مہیا کرتے تھے جنھیں بنیاد بنا کر کچھ مخصوص تصورات کو فروغ دینے کی کوشش کی جاتی تھی۔ یاد رہے کہ میکالے کی طویل نظم کی بنیاد پر جس 'ہیرو' کو حب الوطنی کی بہترین مثال کے طور پر قاری کے سامنے پیش کیا جارہا تھا، اُس کے مقابلے میں اسلام، ہندومت، سکھ مت اور یہاں تک کہ برِصغیر کی مقامی تاریخ میں ایسے سینکڑوں کردار موجود تھے جنھوں نے وطن کی محبت میں جرات اور بہادری کی نئی داستانیں رقم کر کے اپنی جانوں کا نذرانہ دیا تھا۔ یہ الگ بات کہ انجمنِ پنجاب کی نظمیں مقامی باشندوں کے لیے 'حبِ وطن' کے جس تصور کا فروغ چاہتی تھیں، اُس میں مقامی لوگوں کی بہادری اور شجاعت کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی۔ حالات کے جبر اور نو آبادیاتی صورتِ حال کی جکڑ بندیوں نے مختلف تخلیق کاروں کے ذہن و دل پر اِس طرح کا اجارہ قائم کیا تھا کہ وہ اپنی تہذیب وثقافت ہی سے نہیں بلکہ تاریخ سے بھی برگشتہ ہو گئے تھے۔ ابوالکلام قاسمی (پ: ۱۹۵۰ء) ایک جگہ درج بالا صورتِ حال کا محاکمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> کرنل ہالرائیڈ کے عملی اقدامات، لائٹر کے نقطہ نظر کو آگے بڑھاتے ہیں اور دونوں مل کر محمد حسین آزاد کے تسلیم شدہ عملی اور ادبی وقار اور اعتبار کو اپنے مقاصد کی تکمیل کا وسیلہ بنانے اور صورتِ حال کا استحصال کرنے میں پوری طرح کامیابی حاصل کر لیتے ہیں۔ چنانچہ نو آبادیاتی ایجنڈے کے مطابق مغرب کی تہذیبی برتری کو تسلیم کرانے کا جو منصوبہ زیرِ عمل تھا اس کا پہلا مرحلہ اردو والوں کو ان کے اپنے ادب، اپنی تہذیب اور اپنے ماضی قریب کی ثقافت سے برگشتہ کرنا اور اپنے ادب وکلچر کی بے وقعتی کا احساس دلانا تھا[۲۴]۔

انجمن کے زیرِ اہتمام پڑھی جانے والی آزاد کی بیشتر نظمیں اُس فکری گیرائی اور داخلی رَو سے محروم تھیں جو کسی بھی فن پارے کو بقائے دوام کے دربار میں جگہ دلواتا ہے۔ شعریاتِ آزاد کا مطالعہ کرتے ہوئے اُس نو آبادیاتی جبر کو ضرور پیشِ نظر

رکھنا چاہیے، جس نے اُن کی شعر گوئی کی صلاحیتوں کو چند مقررہ حدوں اور طے شدہ سانچوں تک محدود کر دیا تھا۔ تمثیل نگاری کے تحت لکھی گئی اُن کی مختلف مثنویاں مثلاً ’خوابِ امن‘، ’دادِ انصاف‘، ’وداعِ انصاف‘، ’گنجِ قناعت‘ اور ’ابرِ کرم‘ پڑھتے ہوئے اس طرح لگتا ہے جیسے قاری ایک ہی نظم کا کو دوبارہ نہیں بل کہ سہ بارہ پڑھ رہا ہو۔ آزاد اپنی نظم گوئی کے بارے میں جب خود کو ’’خاک افتادہ‘‘[۲۵] کہتے تھے تو وہ کوئی عجزِ بیان نہیں تھا بلکہ اِس رائے میں اُس تنقیدی شعور کا پرتو موجود تھا جس کی مدد سے آزاد نے آبِ حیات (۱۸۸۰ء) جیسی کتاب تصنیف کی تھی۔ نظم گوئی کے لیے اگر اُنھیں مکمل ذہنی آزادی میسر آتی تو ممکن تھا کہ آج اُن کی شاعری عجائبات کے نوادر[۲۶] میں شامل نہ ہوتی۔ آزاد کے مقابلے میں مولانا الطاف حسین حالی کو اس اعتبار سے تفوق حاصل ہے کہ وہ انجمنِ پنجاب سے وابستگی رکھنے والے سب سے اہم نظم نگار تھے۔ گو انجمنِ پنجاب کے تحت منعقد ہونے والے مشاعروں میں حالی نے محض چار نظمیں بعنوان ’برکھا رُت‘، ’نشاطِ امید‘، ’حب وطن‘ اور ’مناظرہ رحم و انصاف‘ سنائیں اور اُس کے بعد وہ طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے دلی روانہ ہو گئے، لیکن حالی کی ان نظموں کا اثر انتہائی گہرا اور دیرپا تھا۔ گوپی چند نارنگ (پ:۱۹۳۱ء) لکھتے ہیں:

> حالی نظم کے امام ہیں۔ اُن سے اُردو شعر و ادب میں ایک خاموش انقلاب کی ابتدا ہوتی ہے۔ انھوں نے زبان و بیان کے نئے سانچے بنائے۔ شاعری کی حدود کو وسیع کیا۔ اسے ایک نصب العین دیا اور سیاسی اور سماجی قدروں کا احساس دلایا[۲۵]۔

حالی کی ابتدائی نظم نگاری کے سیاق میں اُن کا قیامِ لاہور اور انجمن سے وابستگی اس اعتبار سے انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ یہیں اُنھیں مغربی نظم اور اِس کی شعریات سے شناسائی کا موقع ملا۔ مذکورہ عہد میں حالی نے نہ صرف قدیم اور جدید شعریات کو فکری پیمانوں پر پرکھا بل کہ نئے زمانے کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی بھی کوشش کی۔ ایک مٹتی ہوئی تہذیب کی چلمن سے نئے زمانوں کا خواب دیکھتے ہوئے حالی کو نو آبادیاتی صورتِ حال کی اُن پیچیدگیوں کا مکمل شعور تھا، جس نے پورے معاشرے کو جبر و استبداد کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ انجمن کے مشاعروں میں پیش کی جانے والی حالی کی نظمیں دوسرے نظم نگاروں کی نظموں کی طرح اکہری اور سپاٹ نہیں ہیں، یہاں تک کہ فکری اور فنی سطح پر بھی اُن کی نظمیں آزاد سے کہیں بہتر تھیں۔ انجمن کے مشاعرے بعنوان ’حُبِ وطن‘ میں حالی نے اپنی مثنوی میں وطن کی محبت کا جو تصور اجاگر کرنے کی کوشش کی اُس میں آزاد کی طرح یورپی واقعات کو نظم نہیں کیا۔ اُن کی نظم میں آغاز ہی سے مقامی مذاہب کی روایت سے استفادہ کیا گیا۔ نبی پاک ﷺ کی ہجرت اور رام جی کے بن باس لینے کے واقعات متن کو مقامی مذہبی فکر سے مملو کرتے ہیں، لیکن آگے چل کر حالی کی نظم کا بیانیہ اُس وقت نو آبادیاتی جبر کا شکار ہو جاتا ہے جب بیان کنندہ برِ صغیر پر حملہ آور ہونے والی دیگر

قوموں اور افراد کے مقابلے میں مغربی استعمار کاروں کو شائستگی کا خوگر اور خدا کا انعام قرار دیتا ہے۔

پاؤں اقبال کے اکھڑنے لگے
ملک پر سب کے ہاتھ پڑنے لگے
کبھی تورانیوں نے گھر لُوٹا
کبھی دُرّانیوں نے زر لوٹا
کبھی نادر نے قتل عام کیا
کبھی محمود نے غلام کیا
سب سے آخر کو لے گئی بازی
ایک شائستہ قوم مغرب کی
یہ بھی تم پر خدا کا تھا انعام
کہ پڑا تم کو ایسی قوم سے کام[۲۸]

معین احسن جذبی (۱۹۱۲ء۔۲۰۰۵ء) کے الفاظ میں:

> یہ زمانہ درحقیقت حالی کے ذہنی انقلاب کا دور ہے جس میں وہ قدیم و جدید کی کش مکش سے نکلنے اور نئے حالات اور نئے خیالات سے آشنا ہونے لگے تھے[۲۹]۔

حالی کی نظم 'حبِ وطن' کا مطالعہ اس بات پر دال ہے کہ مذکورہ عہد میں نئے زمانے سے شناسائی اور یورپی تہذیب کی چکا چوند نے حالی کو مغربی استعمار کاوں سے اس درجہ مرعوب کر دیا تھا کہ اُن کے نزدیک وطن کی محبت کا حق، مغربی علم کو فروغ دے کر اور ہند کو انگلستان جیسا بنا کر ہی ادا ہوسکتا تھا۔

علم کو کر دو کُو بہ کُو ارزاں
ہند کو کر دکھاؤ انگلستاں[۳۰]

حالی نے انجمن کے پلیٹ فارم سے آخری نظم 'مناظرہ رحم و انصاف'[۳۱] پڑھی تھی۔ یہ نظم اپنی مکالماتی فضا کی بدولت پہلی تین نظموں سے قدرے مختلف نظر آتی ہے۔نظم میں رحم اور انصاف کے مابین ہونے والے مکالمے کے بعد، عقل کا رحم اور عدل کے صحیح مقام کا تعین کرنا اُس نئی نو آبادیاتی حسیّت کا اعلامیہ تھا، جو استعمار زدہ باشندوں کو یہ باور کروانے کی کوشش کرتی ہے کہ اب ہر چیز تعقل کے پیمانوں پہ پرکھی جائے گی۔نظم کے متن میں 'عقل' کا ایک مشعل راہ کے طور پر سامنے آنا اور پھر 'رحم' اور 'انصاف' کے مابین منصفی کروانا مغربی عقل پسندی کے اُس فلسفے کو واضح کرتا ہے جس سے حالی کا تعارف مغربی تہذیب اور

افکار سے شناسائی کے بعد ہی ہوا تھا۔ وحید قریشی (۱۹۲۵ء۔ ۲۰۰۹ء) کے بقول:

> مولانا حالی کے ہاں تنقیدی بصیرت اور شعور کا شاخسانہ یہی انجمن تھی۔ کرنل ہالرائیڈ نے حالی کو قیامِ لاہور کے دوران میں مغربی ادبیات کے تراجم کی اصلاح اور مطالعے کے مواقع فراہم کیے۔ اور یہ بالواسطہ طور پر حالی کے تنقیدی ذہن کو جلا دینے میں معاون ثابت ہوئے [۳۲]۔

آزاد اور حالی کے علاوہ انجمن پنجاب کے مشاعروں میں شریک ہونے والے بیشتر نظم نگاروں کی نظمیں فکری گیرائی سے محرومی کے علاوہ فنی حوالوں سے بھی انتہائی کمزور ہیں ۔ یہ بات کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اگر انجمنِ پنجاب کے مشاعروں میں آزاد اور حالی کی شرکت نہ ہوتی تو استعمار کے ہاتھوں پروان چڑھنے والا نئی شاعری کا یہ منصوبہ جزوی کامیابی سے بھی ہم کنار نہ ہوتا۔ گو حالی انجمنِ پنجاب کے محض چار مشاعروں میں شرکت کرنے کے بعد دلّی روانہ ہو گئے تھے، لیکن قیامِ لاہور کے دوران مغربی شعریات سے شناسائی نے اُن کی باقی ادبی زندگی پر انتہائی گہرے اثرات مرتسم کیے تھے۔ حالی کا ۱۸۹۳ء میں طبع ہونے والا مقدمہ شعر و شاعری بھی دراصل اُنھی افکار کا زائیدہ تھا جو انجمنِ پنجاب کے زیرِ اثر پروان چڑھے تھے۔ اِسی لیے حالی انجمنِ پنجاب کے مشاعروں کو درو بست اور مبالغے کی جا گیر بنی ایشیائی شاعری کو وسعت دینے کی کوششوں سے تعبیر کرتے تھے، حالی کے نزدیک اِن مشاعروں کے قیام کا مقصد کچھ بھی ہو لیکن ابتدائی دو مشاعروں میں نیچرل شاعری کے عنوانات فراہم کرنے کے بعد، نئے حکمرانوں نے باقی مشاعرے محض اُن تصورات کو فروغ دینے کے لیے منعقد کروائے تھے جن کا فروغ مذکورہ عہد میں اشد ضروری تھا۔ اُمید، حب وطن، امن، انصاف، مروت، قناعت اور تہذیب جیسے اخلاقی موضوعات بظاہر علاحدہ علاحدہ ہونے کے باوجود داخلی طور پر مربوط اور ایک مرکز سے جڑے ہوئے تھے۔ ان تمام موضوعات کی تہ میں نو آبادیاتی فکر کی ایک ایسی رَو جاگزیں تھی جو ۱۸۵۷ء کے بعد مقامی باشندوں کے دل و دماغ سے مزاحمت کا آخری خیال بھی نکال دینا چاہتی تھی۔ لارڈ کرومر (Lord Cromer۔۱۸۴۱ء۔ ۱۹۱۷ء) جو مصر میں انگلستان کے نو آبادیاتی اجارے کے دوران وہاں کا حاکم مقرر ہوا تھا، اُس کی درج ذیل رائے نو آبادیاتی عہد میں تشکیل پانے والے ایسے کلامیوں کو واضح کرتی ہے، جن کو فروغ دینے کے لیے انجمنِ پنجاب جیسے نو آبادیاتی اداروں کا ایجنڈا اور موضوعات ترتیب پاتے ہیں:

> علم طاقت کا منبع ہے۔ زیادہ طاقت کے حصول کے لیے علم کی ضرورت ہے تا کہ اطلاعات اور کنٹرول کا نظام قائم کیا جا سکے..... کوشش کی جائے کہ محکوم قوم میں قناعت کے اسباب تلاش کیے جائیں اور حاکم اور محکوم کے درمیان منطق کی بجائے بہتر پُر امید اور مضبوط تعلق قائم کرنے کے طریقے معلوم کر کے ان پر عمل کیا جائے [۳۳]۔

بنیاد

انجمنِ پنجاب کے مشاعرے' حاکم' اور 'محکوم' کے درمیان ایک پُر امید اور مضبوط تعلق قائم کرنے اور استعمار زدہ لوگوں کو قناعت، مروت، تہذیب، امن، انصاف، امید اور حب الوطنی کے نئے تصورات سے روشناس کروانے سے ہی عبارت تھے۔ صفیہ بانو کی تحقیق کے مطابق اس مشاعرے میں شرکت کرنے والے شعرائے کرام یہ تھے:

''مولوی عمّو جان ولی،، پنڈت کرشن لال طالب (اکاؤنٹینٹ صیغہ تعمیرات، راولپنڈی)، ملا گل محمد عالی (مدرس مدرسہ پھلور، ضلع جالندھر)، مفتی امام بخش (رئیس دگالہ بزبان فارسی)، انور حسین، شیخ الٰہی بخش رفیق (رئیس)، مصر رام داس قابل (بزبان فارسی)، مولوی عطا اللہ خان عطا، منشی علاءالدین صافی، لالہ گنڈا مل (مدرس)، سیّد اصغر علی لکھنوی حقیر، مولوی محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی (معاون مترجم، محکمۂ ڈائریکٹری)''[۳۴]۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ حالی اور آزاد کے علاوہ درج بالا شاعروں میں سے کوئی ایک شاعر بھی ایسا نظر نہیں آتا جس نے انجمنِ پنجاب کی شعری روایت کو داخلی آہنگ سے آمیز کرتے ہوئے اپنی انفرادی پہچان بنائی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر شعرا کی نظمیں پڑھ کر نو آبادیاتی عہد میں تخلیق کاروں کی عجلت پسندی اور بدحواسی کا احساس ہوتا ہے۔ دسویں مشاعرے بعنوان 'اخلاق' کے بعد اپریل ۱۸۷۵ء میں ان مشاعروں کا سلسلہ موقوف ہو گیا تھا لیکن اردو نظم کی شعریات کو از سرِ نو متشکل کرنے کا آغاز حقیقی معنوں میں اس کے بعد ہی ہوا۔ استعمار کاروں نے اپنی تہذیبی و ثقافتی برتری کو ثابت کرنے کے لیے عملی اور ادبی سطح پر جس تبدیلی کا آغاز کیا تھا، آگے چل کر وہی تبدیلی مقامی شعریات کو عملِ تقلیب سے گزارنے کا باعث بنی تھی۔ صفیہ بانو انجمنِ پنجاب کے مشاعروں کے خاتمے کے اسباب گنواتے ہوئے لکھتی ہیں:

ان مشاعروں میں حکومتِ وقت کے خلاف بھی اشعار پڑھے گئے۔ غدر کے قصے دہرائے گئے۔ رمز و کنایہ میں امن، حبِ وطن، قناعت کی سرپرستی کرنے والے انگریزوں پر یہ شعرا ایک طرف تو بھروسا نہ کر سکے دوسرے ان کی توقعات پوری نہیں ہوئیں[۳۵]۔

صفیہ بانو کی سے رائے سے اتفاق اس لیے ممکن نہیں ہے کہ اِن مشاعروں میں پڑھی جانے والی اِکا دُکا نظموں کے چند حصوں کے سوا حکومتِ وقت سے انحراف کا کوئی بیانیہ سامنے نہیں آتا۔ یہاں تک کہ 'امن' کے عنوان کے تحت کہی جانے والی جن نظموں میں غدر یا جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کا ذکر ملتا ہے، اُن میں بھی انگریزوں سے زیادہ باغیوں کو موردِ الزام ٹھہرایا گیا ہے۔ انجمنِ پنجاب کے زیرِ انتظام منعقدہ مشاعرے بعنوان 'حبِ وطن' کے متن کا درج بالا تجزیہ یہ واضح کرتا ہے کہ اِن مشاعروں میں شامل شعرا، حب الوطنی کی مثالوں کے لیے بھی، یورپ کی طرف ایڑیاں اٹھا اٹھا کر دیکھنے پر مجبور کر دیے گئے تھے۔ بحیثیتِ مجموعی استعمارکاروں نے انجمن کے مشاعروں سے جو مقاصد حاصل کرنے تھے، اُن میں اُنھیں کافی حد تک

کامیابی حاصل ہوئی تھی لیکن اس کا بالواسطہ فائدہ اردو نظم کو پہنچا تھا۔ اردو نظم میں گُل و بلبل کی حکایت کا بیانیہ بتدریج اپنی کشش کھوتا چلا گیا تھا،عشق ومحبت کی جگہ ملّی اور قومی موضوعات کو مل گئی تھی نیز کلاسیکی شعریات کے زیرِ اثر لکھی جانے والی شاعری کا مفرّس اور معرّب اسلوب مقامی رنگوں سے آشنا ہوگیا تھا۔ انجمن کے زیرِ انتظام منعقد ہونے والے مشاعروں کو اگر زمانی ترتیب سے دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اِن مشاعروں کے اختتام تک دین دیال عاجز، جوالا سہائے کائیستھ خورم جیسے طالب علموں اور تارا چند حلوائی جیسے عام افراد تک اس تبدیلی کا اثر پہنچنا شروع ہو گیا تھا۔ اِن مشاعروں میں پڑھی جانے والی بہت سی نظمیں جہاں فارسی کی ہند اسلامی روایت سے جڑی ہوئی تھیں، وہیں مغربی شعریات کے زیرِ اثر ایسی نظمیں بھی سامنے آئی تھیں جو ہیئتی اور اسلوبیاتی ہر دو سطح پر نئی شعریات کا راستہ ہموار کر رہی تھیں۔ آگے چل کر مغربی اور مشرقی شعریات کے اِسی امتزاج نے اُردو نظم کو نہ صرف ہیئتی سطح پر پابند ہیئت کی تنگنائے سے نکالا بلکہ فکری سطح پر بھی جدید حسّی روّیوں سے آشنا کیا۔





## حوالہ جات و حواشی

* (پ: ۱۹۸۳ء) لیکچرر، شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور۔

۱۔ حافظ محمود شیرانی، پنجاب میں اردو، مرتبہ محمد اکرام چغتائی (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)، ۳۴۲۔

۲۔ صفیہ بانو، انجمن پنجاب تاریخ و خدمات (کراچی: کفایت اکیڈمی، ۱۹۷۸ء)، ۱۰۶۔

۳۔ لارڈ میکالے [Thomas Babington Macaulay]، *Macaulay, Selections from Educational Records Bureau of Education.*، مرتبہ ایچ شارپ [H. Sharp]، (دہلی: نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، دوسری اشاعت، ۱۹۶۵ء)، ۱۱۷-۱۰۷۔

لارڈ میکالے کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> "We must at present do our best to form a class who may be interpreters between us and the millions whom we govern, a class of persons Indian in blood and colour, but English in tastes, in opinions, in morals and in intellect."

۴۔ بحوالہ ناصر عباس نیر، مابعد نوآبادیات اردو کے تناظر میں (کراچی: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۳ء)، ۱۶۶۔

۵۔ لارڈ میکالے [Thomas Babington Macaulay]، *Macaulay, Selections from Educational Records Bureau of Education.*، مرتبہ ایچ شارپ۔

لارڈ میکالے کے اصل الفاظ یہ ہیں:

> "I have never found one among them who could deny that a single shelf of a good European library was worth the whole native literature of India and Arabia."

۶۔ محمد عباس (مترجم) شرق شناسی از ڈبلیو ایڈورڈ سعید [Edward Said] (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۲۰۰۵ء)، ۱۶۔

۷۔ ناصر عباس نیر، مابعد نوآبادیات اردو کے تناظر میں، ۱۶۱۔

۸۔ اکرام چغتائی، ''آزاد اور لائٹنر کے علمی روابط''، مشمولہ آزاد صدی مقالات، مرتبہ تحسین فراقی/ ناصر عباس نیّر (لاہور: شعبۂ اُردو، پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۱۰ء)، ۶۹۔

۹۔ محمد باقر، ''مرحوم انجمنِ پنجاب''، مشمولہ اورینٹل کالج میگزین، جلد ۲۰، عدد ۳ (لاہور: اورینٹل کالج، مئی ۱۹۴۴ء)، ۵۴۔

۱۰۔ اکرام چغتائی، ''آزاد اور لائٹنر کے علمی روابط''، مشمولہ آزاد صدی مقالات، مرتبہ تحسین فراقی، ۸۷۔

۱۱۔ بحوالہ عارف ثاقب، انجمنِ پنجاب کے مشاعرے (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء)، ۲۶۔

۱۲۔ محمد عباس (مترجم) شرق شناسی، ۵۲۔

۱۳۔ جمیل جالبی، تاریخِ ادبِ اردو، جلد چہارم (لاہور: مجلس ترقیِ ادب، ۲۰۱۲ء)، ۱۰۰۵۔

۱۴۔ صفیہ بانو، انجمنِ پنجاب تاریخ و خدمات (کراچی: کفایت اکیڈمی، ۱۹۷۸ء)، ۲۳۳۔

۱۵۔ مولانا محمد حسین آزاد، آبِ حیات (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، س ن)، ۵۶۔

۱۶۔ صفیہ بانو، انجمنِ پنجاب تاریخ و خدمات، ۲۶۷۔

یہ مشاعرہ یکم ستمبر ۱۸۴۷ء کو حُبِ وطن کے عنوان سے منعقد ہوا تھا۔ آزاد اور حالی کے علاوہ اس میں جن گیارہ شعرا نے شرکت کی تھی، اُن کے نام یہ ہیں:

مولوی عمّو جان ولی، پنڈت کرشن لال طالب، ملا گل محمد عالی، مفتی امام بخش، انور حسین ہما، شیخ الٰہی بخش رفیق، مصر رام داس قابل (بزبانِ فارسی)، مولوی عطا اللہ خان عطا، منشی علاء الدین صافی، لالہ گنڈا مل، سیّد اصغر علی لکھنوی حقیر۔

۱۷۔ عارف ثاقب (مرتبہ) انجمنِ پنجاب کے مشاعرے، ۱۹۶۲۶۔

۱۸۔ مولانا محمد حسین آزاد، نظمِ آزاد، مرتبہ تبسم کاشمیری (لاہور: مکتبۂ عالیہ، ۱۹۷۸ء)، ۸۳-۸۲۔

۱۹۔ محمد ابراہیم ''تمہید''، نظمِ آزاد، مرتبہ محمد ابراہیم (لاہور: نول کشور پرنٹنگ پریس، ۱۹۱۰ء)، ۳۔

۲۰۔ عارف ثاقب (مرتبہ) انجمنِ پنجاب کے مشاعرے، ۲۳۶-۲۳۴۔

۲۱۔ ایضاً، ۲۸۸-۲۸۶۔

۲۲۔ صفیہ بانو، انجمنِ پنجاب تاریخ و خدمات، ۲۸۱۔

۲۳۔ لارڈ میکالے [Thomas Babington Macaulay]، *Lays of ancient Rome* (نیو یارک: بوسٹن سیلور، برڈٹ اینڈ کمپنی، ۱۹۰۱ء)، ۱۲۵-

۲۴۔ ابوالکلام قاسمی، ''جدید اردو تنقید، محمد حسین آزاد اور نوآبادیاتی مضمرات''، مشمولہ آزاد صدی مقالات، مرتبہ تحسین فراقی، ۱۳۰۔

۲۵۔ محمد حسین آزاد، مولانا، ''لیکچر''، مشمولہ نظمِ آزاد، مرتبہ تبسم کاشمیری، ۵۲۔

۲۶۔ محمد صادق، محمد حسین آزاد، مشمولہ: تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند، جلد چہارم (لاہور: پنجاب یونیورسٹی، طبع دوم، ۲۰۱۰ء)، ۱۳۰۔

۲۷۔ گوپی چند نارنگ، ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)، ۳۲۱۔

۲۸۔ الطاف حسین حالی، کلیاتِ نظمِ حالی (جلد اوّل)، مرتبہ افتخار احمد صدیقی (لاہور: مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۶۸ء)، ۴۰۲۔

۲۹۔ معین احسن جذبی، حالی کا سیاسی شعور (لاہور: آئینۂ ادب، ۱۹۶۳ء)، ۱۱۰۔

۳۰۔ الطاف حسین حالی، کلیاتِ نظمِ حالی (جلد اوّل)، مرتبہ افتخار احمد صدیقی، ۴۰۷۔

۳۱۔ یہ مشاعرۂ 'انصاف' کے زیرِ عنوان ۱۴ نومبر ۱۸۴۷ء کو منعقد ہوا تھا۔ الطاف حسین حالی نے اس مشاعرے میں اپنی نظم ''مناظرۂ رحم و انصاف'' پیش کی

تھی۔ حالی کے علاوہ اِس مشاعرے میں ۱۲ شعرا شریک ہوئے تھے۔ انجمن پنجاب کے تحت پڑھا جانے والا حالی کا یہ آخری مشاعرہ تھا، اِس کے بعد وہ طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے دلّی روانہ ہو گئے تھے۔

۳۲۔ وحید قریشی، ''دیباچہ'' مشمولہ مقدمہ شعر و شاعری (لاہور: مکتبۂ جدید ۱۹۵۳ء)، ۱۳۔

۳۳۔ بحوالہ محمد عباس (مترجم) شرق شناسی، ۴۲۔

۳۴۔ صفیہ بانو، انجمنِ پنجاب، تاریخ و خدمات، ۲۶۷۔

۳۵۔ ایضاً، ۳۶۷۔

# مآخذ


آزاد، مولانا محمد حسین۔ آبِ حیات۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، س ن۔

تبسم کاشمیری۔ مرتبہ۔ نظمِ آزاد۔ لاہور: مکتبۂ عالیہ، ۱۹۷۸ء۔

تحسین فراقی/ ناصر عباس نیّر۔ مرتبہ۔ آزاد صدی مقالات۔ لاہور: شعبۂ اُردو، پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۱۰ء۔

جذبی، معین احسن۔ حالی کا سیاسی شعور۔ لاہور: آئینۂ ادب، ۱۹۶۳ء۔

جمیل جالبی۔ تاریخِ ادبِ اردو۔ جلد چہارم۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۲ء۔

شیرانی، حافظ محمود۔ پنجاب میں اردو۔ مرتبہ محمد اکرام چغتائی۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء۔

صدیقی، افتخار احمد۔ مرتبہ۔ کلیات نظم حالی۔ جلد اوّل۔ لاہور: مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۶۸ء۔

صفیہ بانو۔ انجمنِ پنجاب، تاریخ و خدمات۔ کراچی: کفایت اکیڈمی، ۱۹۷۸ء۔

عارف ثاقب (مرتبہ)۔ انجمن پنجاب کے مشاعرے۔ لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء۔

گوپی چند نارنگ۔ ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء۔

لارڈ میکالے [Thomas Babington Macaulay]۔ *Lays of ancient Rome*۔ نیو یارک: بوسٹن سیلور، برڈٹ اینڈ کمپنی، ۱۹۰۱ء۔

لارڈ میکالے [Thomas Babington Macaulay]۔ *Macaulay, Selections from Educational Records Bureau of Education.*، مرتبہ ایچ شارپ [H. Sharp]۔ دہلی: نیشنل آرکائیوز آف انڈیا۔ دوسری اشاعت، ۱۹۶۵ء۔

محمد ابراہیم۔ مرتبہ۔ نظمِ آزاد۔ لاہور: نول کشور پرنٹنگ پریس، ۱۹۱۰ء۔

محمد باقر۔ ''مرحوم انجمن پنجاب''۔ مشمولہ اورینٹل کالج میگزین۔ جلد ۲۰، عدد ۳۔ لاہور: اورینٹل کالج، مئی ۱۹۴۴ء۔

محمد زکریا، خواجہ۔ تاریخِ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند۔ جلد چہارم۔ لاہور: پنجاب یونیورسٹی۔ طبع دوم، ۲۰۱۰ء۔

محمد عباس۔ مترجم۔ شرق شناسی از، ایڈورڈ سعید، ڈبلیو۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۲۰۰۵ء۔

نیر، ناصر عباس۔ مابعد نوآبادیات اردو کے تناظر میں۔ کراچی: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۳ء۔